Fikr-o-Nasar (Islamabad) 4:1-2 (1966)

بنک کاری اور اُس کا منافع

پروفیسر ابوشہاب رفیع اللہ

INETREST یعنی بنکوں کے تجارتی منافع نے ہمارے معاشرے میں ایک نہایت ہی پیچیدہ صورت اختیار کرلی ہے۔ ایک طرف شرعی احکام ہیں جن میں ربا کو حرام قرار دیا گیا ہے اور اس پر سخت سے سخت وعید سنائی گئی ہے اور دوسری طرف بنکوں کا عملی کاروبار ہے کہ روز بروز ترقی پذیر ہے اور آج یہ حالت ہے کہ سارے نظامِ تجارت کا دار و مدار اسی پر ہوگیا ہے۔ اس مسئلہ پر کافی عرصہ سے بحثیں ہو رہی ہیں۔ اور میں نے ذاتی طور پر اکثر اہل علم کو اس بارے میں سخت مشوش پایا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت اس معاملے میں تذبذب کا شکار ہے کیونکہ ابھی تک ان کے سامنے کوئی مناسب حل پیش نہیں کیا گیا۔ ربا کی وہ قسم جس میں کسی حاجت مند کی حاجت سے ناجائز فائدہ اٹھاکر بڑھوتری لی جاتی ہے، وہ تو بالاتفاق سب کے نزدیک حرام ہے، اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ اسے آج کل کی اصطلاح میں USUARY کہا جاتا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی منافع پر تجارتی کاروبار کی کئی قسمیں ہیں، جن میں ایک بنکوں کا منافع بھی ہے۔ ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ ربا کی بہتر قسمیں ہیں۔ ان میں سے کچھ اقسام کی تو تعیین کی گئی ہے اور کچھ کی تعیین نہیں کی گئی۔ صحاح ستہ کی ایک روایت ہے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ جن کے ہاتھوں میں تمام امت کی باگ ڈور تھی، اس کی کمی محسوس کرتے تھے۔ اور تمنا فرماتے تھے کہ کاش حضور صلی اللہ علیہ وسلم ربا کی تمام قسموں کی تعیین فرما جاتے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں :-

ثلثا وددت ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان عہد الینا فیھن عہداً

انتھی الیہ، الجد، والکلالۃ، وابواب الربٰو (رواہ الستۃ)

(ترجمہ) تین امور ہیں جن کے متعلق مجھے تمنا ہوتی ہے کہ کاش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے متعلق واضح اور آخری احکام بیان فرما جاتے۔ ایک دادا کا ترکہ، دوسرا کلالہ اور تیسرا ربا کی بعض قسمیں۔

چنانچہ اس عدم تعین کا نتیجہ یہ نکلا کہ ربا کی کچھ ایسی اقسام جنہیں خود رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی زبان مبارک سے تعین فرمایا تھا، بعض فقہی تاویلات کے ذریعہ انہیں جائز قرار دے لیا گیا ہے اور جن کی آپ نے کوئی تعیین نہیں کی اسے ناجائز قرار دے دیا گیا۔ حالانکہ بعض صورتوں میں تو اس جائز اور ناجائز کے درمیان صرف اصطلاحوں کا فرق رہ گیا ہے۔ مثلاً بیع سلم وغیرہ، لیکن آج اگر کوئی صاحبِ علم اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ کتاب وسنت اور آئمہ مجتہدین کی تصریحات کو سامنے رکھ کر اس بارے میں کسی متفق علیہ نتیجہ پر پہنچا جائے تو علمی بحث سے تو کنارہ کر لیا جاتا ہے۔ اور صرف یہ کچھ فرما دیا جاتا ہے :-

"اور اس سے آگے بڑھ کر سود کے جواز کا بھی حسب سابق فتویٰ صادر فرما ڈالا۔ جس کی حرمت پر تمام امت مسلمہ کا ایمان ہے۔ دائرۂ اسلام میں رہنے کا دعویٰ کرتے ہوئے سود جیسی حرام چیز کو جائز کہہ دینا نہایت ناپاک جسارت اور دیدہ دلیری ہے۔ سود کی حرمت دنیا جانتی ہے۔ جس کو قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع اُمت نے زنا، چوری اور قتل نفس کی طرح ناپاک اور حرام اور اس کو اسلامی معاشرت کا بدترین جرم قرار دیا ہے۔" [1]

مضمون نگار صاحب لکھنے کو تو یہ لکھ گئے لیکن انہیں اس کا خیال نہ آیا کہ خود ان کے سربراہ تو ان قسموں کو بھی جائز قرار دے چکے ہیں، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان مبارک سے سود قرار دے گئے تھے۔ حالانکہ جن کمزور فقہی تاویلات کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متعین کردہ صورتوں کو جائز قرار دے لیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ مضبوط فقہی دلائل تجارتی سود یعنی بنک کے منافع کے جواز کے لئے بھی مل جاتے ہیں، اور بعض صورتوں میں تو صرف اصطلاح ہی کا فرق باقی رہ جاتا ہے۔

---

[1] ہفت روزہ ایشیا لاہور ۱۲ جون ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۶ عنوان "ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے جاہلانہ اجتہاد پر ایک نظر"

اب وہ صورتیں ملاحظہ ہوں، جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ربا قرار دینے کے باوجود جائز سمجھا جاتا ہے۔

(۱) پہلی صورت ربوٰ الفضل کی ہے جس کی حرمت پر اس مضمون کی کئی احادیث ہیں۔ الذهب بالذهب مثلاً بمثلٍ وزناً بوزن يد اًبيدٍ والفضل ربواً۔ کہ سونے کے بدلے سونا، دست بدست، وزن میں برابر اور نقد بنقد ہونا چاہیئے۔ اس میں زیادتی سود ہوگا۔ [۲]

سود کی اس قسم کی مزید تفصیل مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی زبانی سنیئے۔ فرماتے ہیں :-

"جیسا کہ ابھی ہم بیان کر چکے ہیں، قدیم زمانے میں تمام سکے" خالص چاندی سونے کے ہوتے تھے اور ان کی قیمت دراصل ان کی چاندی اور ان کے سونے کی قیمت ہوتی تھی۔ اس زمانے میں درہم کو درہم سے اور دینار کو دینار سے بدلنے کی ضرورت ایسے مواقع پر پیش آتی تھی جبکہ مثلاً کسی شخص کو عراقی درہم کے عوض رومی درہم درکار ہوتے یا رومی دینار کے بدلے ایرانی دینار کی حاجت ہوتی۔ ایسی ضرورتوں کے مواقع پر یہودی ساہوکار اور دوسرے ناجائز نفع کمانے والے لوگ کچھ اس طرح کا ناجائز منافع وصول کرتے تھے جیسا کہ موجودہ زمانہ میں روپیہ کی ریزگاری مانگنے والوں یا دس اور پانچ کا نوٹ بھنانے والوں سے کچھ پیسے یا آنے وصول کر لئے جاتے ہیں۔ یہ چیز بھی چونکہ سود خوارانہ ذہنیت کی طرف لے جانے والی ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا کہ نہ تو اس چاندی کا تبادلہ چاندی سے اور سونے کا تبادلہ سونے سے کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے۔ اور نہ ایک درہم کو دو درہم کے عوض بیچنا درست ہے" [۳]

زرمبادلہ کا ناجائز کاروبار آج کل بھی زوروں پر ہے لیکن مقام افسوس ہے کہ جس بات کو سامنے رکھ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سود قرار دیا تھا، اس کے باوجود حج پر جانے والے ہر شخص کو اس کا علم ہے۔ بعض صورتوں میں تو اس ناجائز مبادلہ کی شرح پچاس فیصدی سے بھی زائد ہے اور اکثر ایسے حضرات جن کا خون بنک کے سود کا نام سنتے ہی کھولنے لگتا ہے، اس میں حصہ لینے میں قباحت محسوس نہیں کرتے بلکہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہم پاکستان کے اصل نوٹ بڑے سستے خرید کر لائے ہیں۔ لیکن آج تک کبھی کسی نے بھی حجاج کرام کو اس کی حرمت کے بارے میں تنبیہہ تک نہیں کی اور نہ اس کے

---

[۲] ہدایہ آخرین کتاب الصرف صفحہ ۹۴۔ [۳] سود جدید ایڈیشن لاہور صفحہ ۱۵۷

خلاف آواز اٹھائی ہے۔

(۲) دوسری صورت ۔ مکہ شریف کے مکانوں کا کرایہ ہے۔ اس کے متعلق فرمان نبوی یہ ہے کہ من اجرارض مکة فکانما اکل الربوا۔ جس نے مکہؐ شریف کے مکانوں کا کرایہ لیا، اس نے گویا سود کھایا۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ خود حنفی فقہ کا فتویٰ بھی اسی کے مطابق ہے۔ ویکرہ اجارتھا ایضاً یقولہ علیہ السلام من اجرارض مکة فکانما اکل الربوا۔ مکہ شریف کے مکانوں کا کرایہ ناجائز ہے اس فرمان نبویؐ کے مطابق کہ جس نے اس کا کرایہ لیا، اس نے گویا سود کھایا۔[۴] ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے اس کی وجہ بھی بیان فرما دی کہ مکة حرمٌ حرمها الله لا بیع رباعها واجارة بیوتها۔[۵] (ترجمہ) مکہ شریف کو اللہ تعالیٰ نے حرمت والی جگہ بنایا ہے۔ اس کے مکانوں کا بیچنا یا کرایہ لینا جائز نہیں۔

اس حقیقت سے آج کون ناواقف ہے کہ اس وقت وہاں صورت حالات کیا ہے لیکن کبھی ان میں سے کسی اللہ کے بندے کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ عامة المسلمین تک یہ شرعی حکم ہی پہنچا دیں۔

(۳) تیسری صورت زمین کی بٹائی ہے۔ جس کے ربا ہونے کے متعلق یہ فرمان نبوی ملتے ہیں:۔

(ا) حضرت رافع بن خدیج اپنا قصہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنی کھیتی کو پانی دے رہا تھا۔ وہاں سے حضور صلعم کا گزر ہوا تو پوچھا یہ کس کی کھیتی ہے اور کس کی زمین ہے؟ میں نے عرض کیا۔ میری کھیتی ہے۔ اس میں تخم اور عمل میرا ہے۔ آدھی پیداوار میری ہوگی اور آدھی مالک زمین قبیلہ کی۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم سود کا کاروبار کرتے ہو۔ زمین مالکوں کو واپس کردو اور ان سے اپنا خرچ وصول کرلو۔[۶]

(ب) دوسری روایت بھی سنن ابوداؤد ہی کی ہے اور اس کے راوی حضرت جابر بن عبداللہ ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلعم کو یہ فرماتے سنا کہ جو شخص مزارعت نہ چھوڑے وہ اللہ اور رسولؐ سے لڑائی کے لئے تیار ہو جائے۔[۷]

---

[۴] ہدایہ اخرین کتاب الکراہیة صفحہ ۴۷۳۔ [۵] ایضاً حاشیہ پر۔
[۶] سنن ابو داؤد باب المزارعة۔ [۷] ایضاً۔

محدثین کے نزدیک یہ دونوں احادیث صحیح ہیں۔ محدث ابن صلاح، امام نووی اور دوسرے کئی حفاظ حدیث نے ان تمام احادیث پر عمل کرنے کا فتویٰ دیا تھا۔ جن پر امام ابو داؤد نے سکوت کیا ہے [۵]

امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا اس بارے میں مسلک بھی انہی احادیث کے مطابق ہے۔ تاہم امام صاحب کے ایک شاگرد قاضی ابو یوسف نے لوگوں کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے مضاربت کے اصول پر اس کے جواز کا فتویٰ دیا:

لانه عقد شركة بين المال والعمل فيجوز اعتبارا بالمضاربة ۔

(ترجمہ) کیونکہ یہ مال اور عمل کے درمیان شرکت کا معاملہ ہے، اس لئے مضاربت کے اصول پر جائز ہے۔ قاضی امام ابو یوسف صاحب نے ایک منقول دلیل بھی دی ہے لیکن یہاں اس پر بحث کی ضرورت نہیں۔

اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے یہ امر فیصلہ طلب ہے کہ اگر ایک شخص ایک ہزار روپے کی زمین خرید کر دوسرے شخص کو کاشت کے لئے دے دے اور سال کے بعد اس سے دو سو روپیہ بطور ٹھیکہ یا بٹائی لے لے تو وہ تو شرعاً جائز ہے اور وہی شخص اسی ایک ہزار روپیہ کو بنک میں رکھ کر سال کے بعد تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ روپے لے لے تو کیوں ناجائز ہو؟ اس معاملے پر بڑی غور و فکر کی ضرورت ہے کیونکہ دونوں صورتوں میں اس شخص نے کوئی محنت نہیں کی۔

آج بھی کچھ لوگ امام ابو یوسفؒ کے اس اصول کو سامنے رکھ کر اس قسم کے معاملے کو جائز بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان حضرات کو مضاربت کی اصطلاح کے صحیح مفہوم کا علم نہیں۔ اس لئے بہت سے معاملات میں انھوں نے غلط مبحث کر ڈالا ہے۔

مضاربت کا جو مفہوم ان حضرات کے ذہن میں ہے وہ یہ ہے:۔

"اسلامی قانون نے تجارت و صنعت اور معاشی کاروبار کے تمام شعبوں میں آدمی کو اس بات کی کھلی اجازت دی ہے کہ وہ نفع و نقصان کی شرکت کے اصول پر دوسروں کے ساتھ مضاربت کا معاملہ کرے۔ ایک شخص دوسرے شخص کو روپیہ دے سکتا ہے اور طے کر سکتا ہے کہ اس سے کاروبار

---

۵ مقدمہ سنن ابی داؤد از احمد البناء صفحہ ۷ ۔

کر کے نفع و نقصان میں آدھے یا چوتھائی کا شریک ہو۔ [۱۰]

اور اپنی کتاب "سود" میں مضاربت کی تفسیر فرماتے ہیں، یعنی نفع اور نقصان میں مناسب شرکت [۱۱]

لیکن اگر آپ فقہ کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھیں گے تو آپ کو یہ تعریف ملے گی :-

هی فی اللغة عبارة عن ان یدفع شخص مالا للآخر لیتجر فیه علی ان یکون الربح بینهما علی ما شرط والخسارة علی صاحب المال۔

(ترجمہ) لغت میں مضاربت کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص دوسرے کو تجارت کے لئے سرمایہ دے اس شرط پر کہ نفع تو ان دونوں کے درمیان بمطابق شرط ہوگا۔ لیکن نقصان کا ذمہ دار صرف صاحب سرمایہ ہوگا۔ [۱۲]

یعنی نفع میں تو شرکت ہوگی لیکن نقصان سب کا سب سرمایہ دار کے ذمہ ہوگا۔ کارندہ صرف نفع میں شریک ہوگا۔ نقصان کا ذمہ دار نہ ہوگا اور اس کے علاوہ بقدر مال کارندہ کے بعض اخراجات بھی سرمایہ سے پورے کئے جائیں گے، چاہے نفع ہو یا نقصان۔

اس قسم کے معاملے کو مضاربت کے اصول پر جائز قرار دینے والوں کی خدمت میں عرض ہے کہ خود مضاربت کی شرعی حیثیت میں بھی اختلاف ہے۔ علامہ ابن حزم مراتب الاجماع میں فرماتے ہیں کہ فقہ کے ہر باب کی اصل کتاب و سنت ہے مگر مضاربت کے متعلق ہم نے کتاب و سنت میں اس کی کوئی اصل نہیں پائی۔ [۱۳]

بیع سلم اور تجارتی سود اسلام کے معاشی نظام میں تجارت کا ایک طریقہ بیع سلم ہے جس کی تعریف فقہاء نے یوں فرمائی ہے :

وهو ان یعطی ذهب او فضة فی سلعة معلومة الی اجل معلوم بزیادة فی السعر الموجود عند السلف۔ [۱۴]

---

[۱۰] مسئلہ ملکیت زمین۔ مولانا مودودی صفحہ ۵۸۔ [۱۱] سود جدید ایڈیشن لاہور صفحہ ۲۰۶

[۱۲] الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۲ صفحہ ۴۴۲۔ [۱۳] نیل الاوطار۔ علامہ شوکانی جلد ۵ صفحہ ۲۸۲

[۱۴] الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۲ صفحہ ۳۰۱

(ترجمہ) بیع سلم کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کو ایک معین مدت تک کے لئے سونا یا چاندی کسی ایسے متعین سودے کے لئے دے جس کا نرخ قرض دیتے وقت کے نرخ سے زیادہ ہو۔

اس کی وضاحت اس مثال سے ہوگی کہ ایک شخص کسی کو ایک سو روپیہ قرض دیتا ہے۔ قرض دیتے کے وقت بازار میں گندم کا بھاؤ بیس روپے من ہے۔ اس حساب سے اس رقم کے پانچ من ملیں گے۔ لیکن یہ سو روپیہ اس شرط پر دیا جاتا ہے کہ تین یا چار ماہ یا فصل اٹھانے کے بعد چھ یا سات من گندم کے حساب سے لوں گا۔ اس حساب سے نرخ پندرہ یا سولہ روپے من بنے گا۔ اور اس طرح قرض دینے والا اپنے لئے نفع کی ایک واضح مقدار معین کر دیتا ہے۔ فقہاء کے نزدیک یہ بیع جائز ہے۔

اس قسم کے کاروبار کی ایک اور صورت ہمیں فتاویٰ مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی میں ملتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"اگر ایک خریدار بصورت خرید نقد ایک مال کو سو روپے میں خریدتا ہے اور ادھار کی شکل میں مدت ایک ماہ کے بعد ایک سو تین روپے، دو ماہ کے بعد ایک سو چھ، تین ماہ کے بعد ایک سو نو روپے ادا کرتا ہے تو جائز ہے۔ اور ہر ماہ تین روپے زیادت میں کوئی قباحت نہیں۔ اس طرح ایک تھان کپڑا دے کر اسی حیثیت کے دو تھان لینا دست بدست یا ادھار دونوں جائز ہیں۔ کیونکہ جنسیت کے باوجود کیل، ناپ یا وزن سے اس کی خرید یا فروخت نہیں ہوئی۔"[15]

باوجود کوشش کے مجھے تو یہ سمجھ نہیں آسکا کہ اوپر والے فتویٰ اور تجارتی سود میں کیا فرق ہے۔

لوگوں کو پریشانی سے نجات دلانے کے لئے اس تجویز پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے کہ اگر حکومت تجارتی سود کا تمام نظام اپنے ہاتھ میں لے لے تو میرے خیال میں فقہ کے اس اصول کے مطابق اس کے جواز کی گنجائش موجود ہے۔

ولا ربٰو بین المولیٰ وعبدہ لان العبد وما فی یدہ ملك لمولاہ فلا یتحقق الربٰوا[16]۔ (ترجمہ) آقا اور غلام کے درمیان سود جائز ہے۔ کیونکہ غلام اور اس کی ملکیت میں آقا مالکانہ تصرف کر سکتا ہے۔ اس لئے ربوا ثابت نہیں ہوتا۔

---

[15] فتاوی مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی صفحہ ۱۰۷ ۔ [16] ہدایہ آخرین کتاب الربوا صفحہ ۸۴

حکومت اور رعیت کے تعلق کو بھی اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے بلکہ سود کے فاضل مصنف خود اس قسم کے تصرف کی سفارش کرتے ہیں، فرماتے ہیں :۔

"رہ گیا بنکنگ کا یہ نقصان کہ نفع کی کشش سے جو سرمایہ ان کے پاس اکٹھا ہوتا ہے اُس کی مجتمع طاقت پر عملاً صرف چند ساہوکار قابض و متصرف ہوتے ہیں تو اس کے تدارک کے لئے ہم کو یہ کرنا ہوگا کہ مرکزی ساہوکاری کا سارا کام بیت المال یا اسٹیٹ بنک خود اپنے ہاتھ میں رکھے اور قوانین کے ذریعہ سے تمام پرائیویٹ بنکوں پر حکومت کا اقتدار اور دخل و ضبط اس حد تک قائم کر دیا جائے کہ ساہوکار اپنی مالیاتی طاقت کا بے جا استعمال نہ کریں۔ [۲۲]

تجارتی سود کا یہ نظام جو صرف حکومت کی نگرانی میں ہوگا، اس کی حیثیت بالکل مختلف ہوگی۔ کیونکہ اس میں اس بات کا تو شائبہ تک نہیں ہوگا۔ کہ کوئی ظالم ساہوکار غریبوں کا خون چوس رہا ہے بلکہ نفع اور نقصان دونوں میں قوم شریک ہوگی۔

اس لمبی چوڑی بحث سے یہ حقیقت تو آشکارا ہو گئی ہوگی کہ ابھی تک مسئلہ ربوا کی بعض صورتیں فیصلہ طلب ہیں اور ان کے متعلق گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اہلِ علم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ ان مختلف صورتوں کا علمی جائزہ لیں اور کسی متفقہ فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش کریں تاکہ امتِ مسلمہ کو مزید پریشانی کا شکار ہونے سے بچایا جائے۔

والسلام علی من اتبع الھدی

---

[۲۲] سود جدید ایڈیشن لاہور صفحہ ۳۱۲